Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق

ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 7 , Issue 2
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

Research Article

ڈاکٹر نادیہ اشرف

لیکچرار، شعبہ اردو، نمل، اسلام آباد۔

ڈاکٹر صائمہ نذیر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، نمل، اسلام آباد

اصغر ندیم سید کے ناول "ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر" میں درباری نظام، روحانی اختیار اور جنسی استحصال: تجزیاتی مطالعہ

Dr Nadia Ashraf
Lecturer, Department of Urdu, NUML Islamabad
Dr Saima Nazir
Assistant Professor, Department of Urdu, NUML Islamabad

An Analytical Study Of The Shrine System, Spiritual Authority, And Sexual Exploitation In Asghar Nadeem Syed’s Novel Tooti Hui Tanab Udhar

This study critically examines the representation of the shrine system, spiritual authority, and sexual exploitation in Asghar Nadeem Syed's novel Tooti Hui Tanab Udhar. Set against the historical and cultural landscape of Multan, the novel reconstructs the evolution of shrine culture alongside the social realities of power, politics, and gender. The study argues that the novel does not merely portray individual moral failures but exposes a broader structure in which hereditary spiritual authority, symbolic prestige, and political influence converge to normalize the exploitation of women. Through the characters of Makhdoom Qurban Ali Shah, Shehr Bano, Jamal Zadi, and Moni Shah, the narrative reveals how religious sanctity is transformed into an instrument of patriarchal domination, reducing women to objects of control, exchange, and sexual gratification. The parallel narration of shrines and brothels further demonstrates that both institutions are interconnected through similar mechanisms of power, hierarchy, and gendered exploitation. Employing qualitative textual analysis, the study draws upon the theoretical perspectives of Michel Foucault, Pierre Bourdieu, Sylvia Federici, and Gayle Rubin to interpret the relationship between symbolic power, patriarchy, and the political economy of sexuality. It concludes that Tooti Hui Tanab Udhar presents a profound critique of the degeneration of spiritual institutions, illustrating how the misuse of religious authority ultimately destroys ethical values, social trust, and the sanctity of human relationships. The novel thus emerges as a significant contribution to contemporary Urdu fiction by exposing the complex intersections of spirituality, authority, and sexual exploitation within South Asian society.

Keywords: Asghar Nadeem Syed, Tooti Hui Tanab Idhar, Shrine System, Spiritual Authority, Sexual Exploitation, Patriarchy, Symbolic Power.

اصغر ندیم سید معاصر اردو ادب کے اُن نمایاں تخلیق کاروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے ڈراما، افسانہ اور ناول تینوں اصناف میں اپنے منفرد فکری اور فنی شعور کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ ان کی بنیادی شناخت ایک کامیاب ڈراما نگار کی ہے، تاہم ناول نگاری میں بھی انہوں نے تاریخ، تہذیب، سیاست، مذہب اور سماجی رویوں کو نئے زاویۂ نظر سے برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ "ٹوٹی ہوئی طناب ادھر" ان کا پہلا باقاعدہ ناول ہے، جو ۲۰۱۹ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ اقبال کی نظم "ذوق و شوق" کے ایک مصرعے سے ماخوذ یہ عنوان محض ادبی حسن نہیں رکھتا بلکہ ناول کی فکری جہت کی بھی نشاندہی کرتا ہے، جہاں ماضی کی تہذیبی اور روحانی روایت کو عصرِ حاضر کے سماجی اور اخلاقی بحرانوں کے

تناظر میں از سرِ نو دیکھا گیا ہے۔

یہ ناول ملتان کی تقریباً ہزار سالہ تاریخ کو افسانوی پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ مصنف نے منشی امام بخش قصہ گو کی زبان سے اس شہر کی تہذیب، تصوف، سیاست، اقتدار اور معاشرتی تبدیلیوں کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ تاریخ محض ماضی کا بیان نہیں رہتی بلکہ معاصر سماجی ڈھانچوں کی تفہیم کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ناول کے تینوں ابواب میں ملتان کی تہذیبی تشکیل، صوفی روایت، درباری نظام، اقتدار کی سیاست اور انسانی خواہشات کے مختلف پہلو ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ان کے درمیان موجود فکری رشتے تدریجاً نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔

زیرِ نظر مضمون کے تناظر میں اس ناول کی اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ مصنف درباری نظام کو صرف روحانی عقیدت یا مذہبی روایت کے مظہر کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ اس کے پس پردہ کارفرما طاقت، سماجی اختیار اور جنسی استحصال کے پیچیدہ تعلقات کو بھی بے نقاب کرتے ہیں۔ ناول یہ واضح کرتا ہے کہ جب روحانی اختیار غیر مشروط تقدیس اختیار کر لیتا ہے تو وہ محض مذہبی اثر و رسوخ تک محدود نہیں رہتا بلکہ انسانی جسم، خصوصاً عورت، پر اختیار قائم کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ اسی تناظر میں "ٹوٹی ہوئی طناب ادھر" درباری نظام کی اس داخلی ساخت کو آشکار کرتا ہے جس میں تقدیس، اقتدار اور جنسیت ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہوئے استحصالی رویوں کو جنم دیتے ہیں، اور یہی پہلو اس تحقیقی مطالعے کا بنیادی مرکز ہے۔

"ٹوٹی ہوئی طناب ادھر" میں ملتان کی تہذیب کا مطالعہ محض تاریخی اور ثقافتی بیانیے تک محدود نہیں رہتا بلکہ مصنف تصوف اور درباری نظام کے ان پوشیدہ پہلوؤں کو بھی سامنے لاتے ہیں جو روحانی تقدیس کے نام پر سماجی اور جنسی استحصال کو فروغ دیتے ہیں۔ ناول میں گدی نشینی کو ایک ایسے اقتداری ڈھانچے کے طور پر پیش کیا گیا ہے جہاں بعض سجادہ نشین روحانی مرتبے کو عوام پر اثر و رسوخ قائم کرنے، معاشی مفادات حاصل کرنے اور ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مصنف یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ عقیدت مند عوام کی غیر مشروط وابستگی اور تقدیس کا تصور اس استحصالی نظام کو مزید مضبوط بناتا ہے، حتیٰ کہ بعض مواقع پر نوجوان لڑکیوں کو بھی روحانی فیض یا خاندانی سعادت کے نام پر گدی نشینوں کی خواہشات کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ناول تصوف کی اصل روح پر تنقید نہیں کرتا بلکہ اس درباری نظام کا محاکمہ کرتا ہے جہاں روحانی اختیار اخلاقی اور انسانی اقدار کے بجائے طاقت، مفاد اور جنسی بالادستی کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ یہی فکری جہت اس تحقیقی مطالعے کی بنیاد فراہم کرتی ہے، جہاں دربار، روحانی اقتدار اور جنسی استحصال کے باہمی تعلق کو ناول کے متن کی روشنی میں پرکھا جائے گا۔

''گدی تو محکمہ اوقاف کے قبضے میں تھی مگر سجادہ نشین مخدوم قربان علی شاہ عرف بہادر علی سیاسی اثر رسوخ کی وجہ سے بہت سے حقوق پر قابض تھا۔ ایک تو اس نے درگاہ کے اطراف کی زمینیں، ملی بھگت سے اپنے نام کرالی تھیں۔ دوسرے مریدین میں اس کی دھاک بٹھانے کے لیے ایک پورا محکمہ موجود تھا۔''[1]

اصغر ندیم سید درباری نظام کی داخلی ساخت کو بے نقاب کرتے ہیں، جہاں روحانی منصب محض مذہبی خدمت کا ذریعہ نہیں رہتا بلکہ معاشی مفادات، سماجی بالادستی اور سیاسی اثر و رسوخ کے حصول کا ایک منظم وسیلہ بن جاتا ہے۔ اگرچہ درگاہ قانونی طور پر محکمۂ اوقاف کے زیرِ انتظام ہے، لیکن مخدوم قربان علی شاہ اپنی سیاسی طاقت اور مریدین کے وسیع نیٹ ورک کی بدولت اس پر عملاً قابض نظر آتا ہے۔ اس صورتِ حال سے واضح ہوتا ہے کہ درباری نظام کی اصل قوت قانونی اختیار سے زیادہ عوامی عقیدت اور روحانی تقدیس میں پوشیدہ ہے، جسے گدی نشین اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ زمینوں پر قبضہ، سیاسی رسوخ اور مریدین پر غیر معمولی اثر اس علامتی اقتدار (Symbolic Power) کی مختلف صورتیں ہیں۔

Pierre Bourdieu [2] کے مطابق مذہبی اور سماجی تقدیس ایک ایسی علامتی طاقت (Symbolic Capital) پیدا کرتی ہے جو بسا اوقات قانونی اور سیاسی طاقت سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ ناول میں مخدوم قربان علی شاہ اسی علامتی سرمائے کو معاشی اور سماجی اختیار میں تبدیل کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہی غیر محدود روحانی اختیار آگے چل کر عورت کے جسم پر بھی حقِ تصرف کا جواز بننے لگتا ہے۔ اس اعتبار سے "ٹوٹی ہوئی طناب ادھر"، یونس جاوید کے ناول "کنجری کا پل" اور طاہرہ اقبال کے "نیلی بار" کے پیر اسرار کی فکری روایت سے جڑتا ہے، جہاں روحانی منصب رفتہ رفتہ اخلاقی تربیت کے بجائے شخصی خواہشات اور جنسی استحصال کے وسیلے میں تبدیل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

اصغر ندیم سید اس استحصالی ڈھانچے کی بنیاد ہی ابتدا میں آشکار کر دیتے ہیں تاکہ قاری یہ سمجھ سکے کہ بعد میں وقوع پذیر ہونے والے جنسی استحصال کے واقعات کسی انفرادی اخلاقی لغزش کا نتیجہ نہیں بلکہ اسی طاقتور درباری نظام کی منطقی پیداوار ہیں۔

"وہ مخدوم زادی اپنی داستان امراؤ جان ادا بیان کرتے ہوئے بولی" کہ میری ماں مخدوم علی قربان شاہ سجادہ نشین کی رعایا میں شامل تھیں۔ ہر جمعرات کو مخدوم سائیں درگاہ پر تشریف لاتے تھے۔ میرے نانا جان کہ رعیت میں شامل تھے اور درگا کے انتظام وانصرام اور لنگر خانے کے ناظم تھے۔ ہفتے کے سات دنوں میں کیا کچھ لنگر خانے میں تیار ہوگا ان کی ذمہ داری تھی۔ کبھی کبھی میری ماں بھی ابا کے ساتھ لنگر خانے جاتی تھیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ لنگر خانے میں سبزیاں، چاول اور گوشت تھال کے تھال سجے ہوتے تھے اور پھر ابا حکم دیتے کہ کیسے کیسے کیا دیگوں میں ڈالنا ہے۔" ۳

اصغر ندیم سید اس منظر کے ذریعے یہ باور کراتے ہیں کہ درباری نظام میں استحصال کا آغاز جبر سے نہیں بلکہ اعتماد، عقیدت اور خدمت کے رشتوں سے ہوتا ہے۔ یہی تعلق بعد ازاں اس مقام تک پہنچتا ہے جہاں گدی نشین روحانی تقدیس کے سہارے مریدوں کے گھریلو اور خاندانی معاملات پر بھی اثر انداز ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے شہر بانو کی روایت صرف ایک خاندان کی کہانی نہیں بلکہ اس سماجی ڈھانچے کی تمہید ہے جس میں روحانی اختیار رفتہ رفتہ عورت کے وجود تک اپنی رسائی قائم کر لیتا ہے۔ اس تناظر میں یہ اقتباس بعد میں رونما ہونے والے جنسی استحصال کے واقعات کی فکری بنیاد فراہم کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ درباری نظام میں جسمانی استحصال سے پہلے اعتماد اور عقیدت کا استحصال وقوع پذیر ہوتا ہے۔

"جب میری ماں پر ان کی نظر پڑی تو پھر اٹھ نہ سکی۔۔۔ نانا جان بولے، یہ اپنی بالڑی ہے۔ آپ نے ہی اس کا نام رکھا تھا، شہر بانو اپنی گود میں بچی کو بٹھا کر دعا دی تھی، جب یہ پیدا ہوئی۔ اب مخدوم صاحب نے پلک جھپکی۔ ساتھ ہی نانا جان نے اشارہ دیا کہ مخدوم صاحب کے پاؤں چھولو۔۔۔ اب مخدوم صاحب کو یاد دلایا گیا کہ شہر بانو نام بھی آپ نے دیا تھا۔ اور بس اتنا بولے یہ لڑکیاں بھی انگوروں کی بیل کی طرح جلدی پھیل جاتی ہیں۔ خیر دعا کا بھی اثر تو ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔" ۴

مخدوم قربان علی شاہ کا شہر بانو کو بچپن سے پہچاننا، اس کا نام رکھنا اور پھر برسوں بعد اسی لڑکی پر خصوصی نگاہ ڈالنا اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ درباری نظام میں روحانی وابستگی محض مذہبی مراسم تک محدود نہیں رہتی بلکہ مریدوں کے گھریلو اور نجی معاملات تک پھیل جاتی ہے۔ یہاں "دعا" اور "شفقت" کی زبان بظاہر روحانی فضا پیدا کرتی ہے، لیکن ناول نگار نہایت باریک اسلوب میں یہ احساس بھی ابھارتے ہیں کہ اسی تقدیس کی آڑ میں گدی نشین رعایا کی بیٹیوں پر ایک غیر اعلانیہ حقِ نگرانی قائم کر لیتا ہے۔ چنانچہ "یہ لڑکیاں بھی انگوروں کی بیل کی طرح جلدی پھیل جاتی ہیں" جیسے جملے میں محض عمر کے بڑھنے کا ذکر نہیں بلکہ عورت کو ایک ایسی شے کے طور پر دیکھنے کا زاویہ بھی پوشیدہ ہے جس پر نگاہ رک سکتی ہے اور جس کے مستقبل کا فیصلہ صاحبِ اختیار کی مرضی سے وابستہ ہو سکتا ہے۔ مصنف ابھی کسی واضح واقعے کو بیان نہیں کرتے بلکہ قاری کو اس ذہنی فضا سے آشنا کرتے ہیں جہاں تقدیس اور شخصی رغبت کے درمیان حدیں دھیرے دھیرے معدوم ہونے لگتی ہیں، اور یہی کیفیت آگے چل کر درباری نظام کی اصل ماہیت کو آشکار کرتی ہے۔

"اب ایسا ہوا کہ چند دن کا وقفہ پڑا اور مخدوم صاحب قربان علی شاہ عرف سجادہ نشین بہار علی نے نانا جان کو طلب کر کے اپنا حکم سنا دیا کہ جسے میں نے نام دیا تھا "شہر بانو" اب اس کا رشتہ مانگ رہا ہوں۔ گود میں بٹھایا تو کیا ہوا؟ مرد کا اصل تو مرد ہی کا اصل ہوتا ہے۔ اس لیے شہر بانو کو میرے پردے میں دے دو۔ اس کا اصل تو یہی پردہ ہے۔ میرے زنان خانے میں آجائے گی تو اللہ کی نظر میں پاکباز ٹھہرے گی۔ سو پردوں میں لپٹی رہے گی۔ پیر زادی بنے گی، مرشد زادی کہلائے گی۔ حضرت بی بی کہلائے گی۔ قبلہ گاہی بنے گی۔ درگاہی بی بی بنے گی اور کیا چاہیے؟ اب نانا جان کا سر مزید جھک گیا بلکہ نانا جان اسے اپنے لیے فضیلت سمجھ تھے یا نیاز مندی کے اعلیٰ درجے پر پہنچنے کی سعی کر رہے تھے۔" ۵

مذکورہ بالا اقتباس میں وہ اشارہ باقاعدہ مطالبۂ نکاح میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ مخدوم اپنے فیصلے کو کسی ذاتی خواہش کے بجائے روحانی مرتبے، مذہبی فضیلت اور تقدیس کی زبان میں پیش کرتا ہے۔ "پیر زادی"، "مرشد زادی"، "حضرت بی بی" اور "درگاہی بی بی" جیسے القابات دراصل اس مذہبی بیانیے کا حصہ ہیں جس کے ذریعے ایک عام لڑکی کے لیے گدی نشین کے حرم میں داخل ہونا اعزاز اور سعادت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف شہر بانو کے والد کا سر جھکا دینا اس بات کی علامت ہے کہ عقیدت اس حد تک اطاعت میں ڈھل چکی ہے جہاں ذاتی اختیار، باپ کی ذمہ داری اور بیٹی کی رضا سب پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ مصنف نہایت باریک بینی سے واضح کرتے ہیں کہ جب روحانی منصب سوال سے بالاتر ہو جائے تو اس کے فیصلے بھی الہامی تقدیر کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی ذہنی اور سماجی فضا آگے چل کر اس نظام کو ہر قسم کے احتساب سے محفوظ بنا دیتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ منظر یونس جاوید کے "کنجری کا پل" میں بابا حضرت عطار اور طاہرہ اقبال کے "نیلی بار" میں پیر اسرار کے کرداروں کی یاد دلاتا ہے، جہاں روحانی مرتبہ رفتہ رفتہ ذاتی خواہشات کے لیے سماجی جواز میں تبدیل ہوتا دکھائی دیتا ہے، اگرچہ اصغر ندیم سید اس عمل کے ابتدائی مرحلے کو زیادہ تدریجی اور نفسیاتی انداز میں آشکار کرتے ہیں۔

"اب ناناجان تو جیسے خانوادے کے اصیل خادم ٹھہرے۔ وفاداری کا اسمِ اعظم تو جیسے گھوٹ کے پی رکھا تھا۔ سو دوزانو ہو کر بولے" جی مخدوم صاحب آپ ہی کی امانت ہے"۔ شاید ناناجان اپنی بیٹی کے ذریعے کوئی رتبہ حاصل کرنا چاہتے تھے یا محض یہ عقیدت کی کارگزاری تھی۔ یا پھر درگاہ کی سبز بوٹی کا کمال تھا کہ وہاں سبز بوٹی کا بھی راج تھا۔"٦

مخدوم قربان علی شاہ کے مطالبۂ نکاح کے بعد ناول نگار اس فیصلے کے دوسرے رخ، یعنی مرید کی ذہنی کیفیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ شہر بانو کے والد کا اپنی بیٹی کو "امانت" قرار دینا اس بات کی علامت ہے کہ درباری نظام میں بعض اوقات اولاد بھی ذاتی ملکیت کے بجائے مرشد کی عطا اور اسی کی امانت تصور کی جانے لگتی ہے۔ اس مقام پر باپ کی حیثیت ایک سرپرست کی نہیں بلکہ ایک مطیع مرید کی بن جاتی ہے، جس کے لیے مرشد کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرنا دینی فضیلت اور روحانی کامیابی کا ذریعہ ہے۔ مصنف اسی ذہنی ساخت کو "سبز بوٹی" کی استعاراتی ترکیب سے بیان کرتے ہیں۔ یہ محض کسی کرامت کا استعارہ نہیں بلکہ اس کیفیت کی علامت ہے جس میں غیر معمولی عقیدت انسان کی تنقیدی بصیرت کو ماند کر دیتی ہے۔ یوں فیصلہ شعوری انتخاب کے بجائے روحانی مسحوری کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ یہی وہ سماجی فضا ہے جہاں سوال کرنے کے بجائے اطاعت کو عبادت سمجھا جاتا ہے، اور اسی خاموش قبولیت کے سہارے درباری نظام اپنی داخلی قوت اور تسلسل برقرار رکھتا ہے۔

"ان میں سے پہلی بیوی بولی "دیکھو یہ دودھ فروٹ میں تمہارے لیے لائی ہوں اور ہاتھوں سے کھلا پلا کے تیار کروں گی کہ مرشد جی ذرا ہاٹھی کاٹھی کے مضبوط اور حکیموں، ویدوں اور خاندانی نسخوں پر پل کے جوان ہوئے ہیں اس لیے تمہاری چیخیں اس حجلہ عروسی سے باہر نہیں جانی چاہیں۔ اپنے پر قابو، ضبط اور حوصلے اور برداشت کا پہلی رات تو تمہیں مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد تم عادی ہو جاؤ گی۔۔۔"٧

شہر بانو کے نکاح کے بعد ناول درباری نظام کے اس داخلی پہلو کو آشکار کرتا ہے جو عام مریدین کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ مخدوم قربان علی شاہ کی سابقہ بیویوں کا نئی دلہن کو ازدواجی زندگی کے لیے تیار کرنا بظاہر گھریلو روایت معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے پس منظر میں گدی نشین کی غیر معمولی مردانہ حیثیت کو ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر قبول کیا جا رہا ہے۔ "حکیموں، ویدوں اور خاندانی نسخوں پر پل کر جوان ہوئے ہیں" جیسے جملے اس تصور کو تقویت دیتے ہیں کہ جنسی قوت بھی مرشد کی عظمت اور فوقیت کا حصہ ہے، جسے قابلِ فخر وصف کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ شہر بانو کو پہلی ہی رات صبر، برداشت اور خاموشی کی تلقین اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس نظام میں عورت سے باہمی تعلق یا رضامندی کے بجائے اطاعت اور تحمل کی توقع رکھی جاتی ہے۔ یوں درباری حرم کی داخلی فضا عورت کو ایک ایسے کردار میں ڈھال دیتی ہے جہاں اس کی ذات سے زیادہ مرشد کی خواہش اور وقار کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اصغر ندیم سید اسی منظر کے ذریعے بتاتے ہیں کہ جب روحانی شخصیت کو انسانی کمزوریوں سے ماورا سمجھ لیا جائے تو اس کی نجی زندگی بھی سوال سے بالاتر قرار پاتی ہے، اور یہی غیر مشروط تقدیس آگے چل کر عورت کی آزادی اور اس کے وجود کو محدود کرنے والے رویوں کو جنم دیتی ہے۔

"جب میں اس کے پیٹ میں آئی تو ماں نے میرے سے مکالمہ کیا ہو گا جواب میرے دھیان میں آ رہا ہے۔" اگر تو لڑکی ہو گی میں اس سے کہوں گی کہ اس دنیا میں مت آؤ۔ یہاں بہت سے اصیل مرغے موجود ہیں جو کمزور مرغیوں پر چڑھ جاتے۔ اس دنیا میں لڑکیوں کے کوئی جگہ نہیں ہے۔ چھ مہینے کی بچی کو بھی ریپ کر دیا جاتا ہے اور پھر ہر عمر کے ساتھ لڑکی کی حفاظت لازمی کی جانی چاہیے ورنہ وہ باپ، بھائی، ماموں، چچا، دادا، نانا، خالو کے ہاتھوں کچلی جاتی ہے۔"٨

مخدوم قربان علی شاہ کی موت کے ساتھ اگرچہ ایک گدی نشین کا کردار ختم ہو جاتا ہے، لیکن شہر بانو کی زندگی میں محرومی اور بے اختیاری کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ نئی انتظامیہ کی جانب سے سابقہ بیویوں کو حرم سے بے دخل کر دینا اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ درباری نظام میں عورت کی حیثیت اس کے اپنے وجود سے نہیں بلکہ گدی نشین سے وابستگی کے سبب متعین ہوتی ہے۔ اسی پس منظر میں جمال زادی اپنی ماں کے باطنی کرب کو ایک فرضی مکالمے کی صورت میں بیان کرتی ہے، جہاں عورت کی زندگی مسلسل خوف، عدم تحفظ اور جسمانی خطرات کے استعارے میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ بیان کسی ایک خاندان یا ایک دربار کی داستان نہیں بلکہ اس وسیع سماجی رویے کی نشاندہی کرتا ہے جس میں عورت کا جسم ہر مرحلے پر مردانہ اختیار کا میدان بن جاتا ہے۔ مصنف اس مکالمے کے ذریعے اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جب معاشرہ عورت کو ایک خود مختار انسان کے بجائے مرد کی ملکیت سمجھنے لگے تو استحصال کی شکلیں صرف دربار یا جاگیرداری تک محدود نہیں رہتیں بلکہ خاندانی رشتوں کے تقدس کو بھی مجروح کر دیتی ہیں۔ اس طرح ناول درباری نظام کی تنقید کو ایک وسیع تر سماجی تناظر میں استوار کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ روحانی مراکز میں جنم لینے والی بالادستی کی یہی ذہنیت معاشرے کے دیگر اداروں میں بھی سرایت کر جاتی ہے۔

"اب میں آپ سے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر اپنی زندگی کی داستان بتا سکتی ہوں کہ میں ایک راندہ درگاہ، محفلوں اور درگاہوں کے چراغوں کا دھواں رہ چکی ہوں۔ ایسے میں کون میری کہانی سنے گا۔ آپ تشریف لائے تو من کی مراد پوری ہوئی۔"٩

درگاہ میں عزت اور پناہ سے محروم ہونے والی عورت کے لیے معاشرہ بھی اپنے دروازے بند کر دیتا ہے، یہاں تک کہ اس کی زندگی کا سفر چکلے تک جا پہنچتا ہے۔
''راندۂ درگاہ'' اور ''چراغوں کا دھواں'' جیسے استعارات نہ صرف اس کی ذاتی محرومی کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ اس پورے سماجی المیے کو بھی سمیٹ لیتے ہیں جہاں روحانی مراکز سے وابستہ عورتیں، تقدیس کے حصار سے نکلتے ہی شناخت، عزت اور تحفظ سے بھی محروم ہو جاتی ہیں۔ اصغر ندیم سید اس کردار کے ذریعے یہ باور کراتے ہیں کہ استحصال کا المیہ صرف دربار کی چار دیواری تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے اثرات عورت کی پوری سماجی زندگی پر محیط ہو جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے جمال زادی کی داستان ایک فرد کی سرگزشت نہیں بلکہ اس سفر کی علامت ہے جس میں روحانی وابستگی سے شروع ہونے والی بے اختیاری بالآخر سماجی حاشیے اور جسمانی استحصال تک جا پہنچتی ہے۔ یہی تدریجی ربط اس ناول کو محض درباری نظام کی تنقید سے آگے بڑھا کر عورت کی سماجی بے وطنی اور وجودی المیے کا بیانیہ بنا دیتا ہے۔

''مونی شاہ نے جتنی جلدی قدم بڑھایا اتنی جلدی اس نے ماں کا بدلہ لینے کے لیے مجھ سے ضد کا رشتہ بنالیا۔ وہ ایسے کہ اسے لگتا تھا کہ میں اس کا راستہ روک لوں گی اور میں روک بھی سکتی تھی کہ میری کاٹھی دنیا میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔۔۔ راہداریوں میں مونی شاہ نے جوانی کی پہلی سیڑھی پر پرانی حوالی کی غلام گردش میں خدمت پر مامور دایہ منظوراں مائی کی بیٹی کنیزاں کو حاملہ کر دیا۔ بات کو دبانے کے لیے کنیزاں کو زمین میں دبا دیا گیا۔''۱۰

مخدوم قربان علی شاہ کی وفات کے بعد بظاہر گدی کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے، لیکن ناول یہ واضح کرتا ہے کہ درباری نظام کسی ایک فرد کے ساتھ ختم نہیں ہوتا بلکہ اپنی اقدار اور طرزِ فکر کو اگلی نسل میں منتقل کر دیتا ہے۔ مونی شاہ اسی موروثی اقتدار کی نمائندگی کرتا ہے، جو گدی کو صرف روحانی منصب نہیں بلکہ ہر قیمت پر محفوظ رکھنے والی جاگیر سمجھتا ہے۔ کنیزاں کو حاملہ کرنے اور بعد ازاں اس کے قتل کے ذریعے ثبوت مٹانا محض ایک انفرادی جرم نہیں بلکہ اس ذہنیت کا اظہار ہے جس میں گدی، خاندانی وقار اور اقتدار کی حفاظت انسانی جان اور اخلاقی اقدار سے زیادہ اہم قرار پاتی ہے۔ جمال زادی چونکہ اس واقعے کی چشم دید گواہ ہے، اس لیے وہ مونی شاہ کے لیے مستقبل کا خطرہ بن جاتی ہے، اور اسی خوف کے باعث شہر بانو اور اس کی بیٹی کو درگاہ سے بے دخل ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یوں مصنف اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ درباری نظام میں ظلم صرف گدی نشین تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کی آئندہ نسل بھی اسی اقتدار کی منطق کو اپناتے ہوئے ہر اس آواز کو خاموش کر دیتی ہے جو اس کی مذہبی یا سماجی ساکھ کے لیے خطرہ بن سکتی ہو۔ اس منظر کے بعد شہر بانو اور جمال زادی کا درگاہ سے بے دخلی کا سفر دراصل ایک حادثاتی واقعہ نہیں بلکہ اسی موروثی اقتدار کی ناگزیر پیداوار معلوم ہوتا ہے، جو آگے چل کر ان کی پوری زندگی کا رخ بدل دیتا ہے۔

'' اور سنو صاحب رنڈیوں اور طوائفوں کے بھی شجرہ نسب ہوتے ہیں۔ اگر نہیں پتہ تو دنیا میں رنڈی خانوں، چکلوں، کوٹھوں اور بالا خانوں کے روزنامچے نکلوا کے دیکھ لو۔ معلوم پڑے گا۔ کون سی ٹھسے دار طوائف کس بادشاہ کی بیٹی تھی۔ کون سی ڈیرہ دارنی کس جاگیر دار کی حویلی سے تھی اور کون سی رنڈی کس سجادہ نشین کی درگاہ کی غلام گردش سے تھی اور ہاں یہ بھی سن لو۔ پاکستان کے ایک سیاسی سجادہ نشین نے گانے بجانے والی سے خفیہ شادی کی۔ اور پھر اس سے جو بیٹی ہوئی۔ معلوم ہے وہ کون ہے۔۔۔ اتنا بڑا بیان سن کر مونی شاہ تو جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔''۱۱

شہر بانو اور جمال زادی کی درگاہ سے بے دخلی کے بعد ان کی زندگی جس سمت بڑھتی ہے، وہ دراصل اس درباری نظام کے داخلی تضادات کو بے نقاب کرتی ہے جس نے پہلے انہیں تقدیس کے حصار میں رکھا اور پھر اسی تقدیس کے نام پر بے آسرا کر دیا۔ معاشرے کی بے اعتنائی اور دربار کی بے رحمی کے نتیجے میں جمال زادی چکلہ آباد کرنے پر مجبور ہوتی ہے، مگر ناول نگار اسے محض جسم فروشی کی جگہ نہیں بناتے بلکہ اسے ایک ایسی علامتی عدالت میں تبدیل کر دیتے ہیں جہاں اقتدار کے اصل چہرے بے نقاب ہوتے ہیں۔ مونی شاہ کا اسی چکلے میں لذت کی تلاش میں پہنچ جانا محض اتفاق نہیں بلکہ ایک بھرپور ادبی ستم ظریفی (Irony) ہے۔ جس گدی کے وقار، نسب اور تقدیس کی حفاظت کے لیے شہر بانو اور اس کی بیٹی کو درگاہ سے نکالا گیا تھا، اسی گدی کا وارث آخر کار اسی عورت کے سامنے کھڑا ہوتا ہے جسے اس نے سماجی طور پر بے حیثیت بنا دیا تھا۔

جمال زادی کا یہ مکالمہ ناول کے اہم ترین فکری بیانات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ باور کراتی ہے کہ طوائف یا رنڈی کی شناخت ہمیشہ اس کے اپنے انتخاب کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ اس کے پس پشت اقتدار، جاگیر داری، درباری سیاست اور مذہبی اشرافیہ کی ایک طویل تاریخ کارفرما ہوتی ہے۔ "کون سی رنڈی کس سجادہ نشین کی درگاہ کی غلام گردش سے تھی" کا جملہ دراصل اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ برصغیر کے بعض ادوار میں مذہبی، جاگیر دارانہ اور سیاسی طاقت کے مراکز ایک دوسرے سے الگ نہیں تھے بلکہ باہم پیوست تھے۔ اسی لیے مصنف دربار اور چکلے کو دو متضاد دنیائیں نہیں بلکہ ایک ہی سماجی ساخت کے دو مختلف رخ قرار دیتے ہیں۔ اس تناظر میں Michel Foucault کا یہ تصور اہم معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار خود کو صرف قوانین یا اداروں کے ذریعے نہیں بلکہ سماجی رویوں، روایتوں اور روزمرہ تعلقات کے ذریعے بھی برقرار رکھتا ہے۔ اسی طرح

Pierre Bourdieu کے مطابق سماجی وقار (Symbolic Capital) اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اس کے پس پردہ موجود مفادات سوال سے محفوظ رہیں۔ اصغر ندیم سید انہی پردوں کو چاک کرتے ہوئے دکھاتے ہیں کہ جس دربار کو عوام روحانی مرکز سمجھتے ہیں، اس کے باطن میں طاقت، نسب، جنس اور مفاد کا ایسا گٹھ جوڑ موجود ہے جو بالآخر عورت کو سب سے زیادہ قیمت ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ۱۲

''تم کون ہو، میں کچھ بھی نہیں۔ صرف مخدوم علی قربان شاہ عرف بہار علی کی بیٹی ہوں اور تم کون ہو۔ بولو۔ اب موتی شاہ کے کاٹو تو لہو نہیں اور پردہ ہٹا کر جمال زادی سامنے براجمان ہو گئی۔ اب موتی شاہ میں کیا دم کہ بولے۔ سامنے بہن بیٹھی تھی۔ ۱۳

یہ منظر ناول کے تمام سابقہ واقعات کو ایک ہی نقطے پر مجتمع کر دیتا ہے۔ ابتدا میں جس درباری نظام کو روحانی تقدیس، مریدی، نسب اور گدی کی عظمت کے استعارے کے طور پر پیش کیا گیا تھا، اسی نظام کا آخری وارث ایک ایسے چکلے میں اپنی ہی سوتیلی بہن کے سامنے کھڑا ہے جہاں وہ جنسی آسودگی حاصل کرنے آیا تھا۔ اصغر ندیم سید اس منظر کو محض ایک خاندانی سانحہ نہیں بناتے بلکہ اسے پورے درباری نظام کے اخلاقی انہدام کی علامت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ جمال زادی کا اپنا تعارف "مخدوم علی قربان شاہ عرف بہار علی کی بیٹی" کے طور پر کرانا اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ جس دربار نے عورت کو تقدیس، پردے اور روحانی نسبت کے نام پر اپنی ملکیت بنایا، اسی دربار نے بالآخر اسے اس مقام تک پہنچا دیا جہاں اس کی شناخت ایک طوائف سے زیادہ باقی نہ رہی۔ اس سے بڑی ستم ظریفی شاید ممکن نہیں کہ گدی کا وارث اپنی ہی بہن کو پہچانے بغیر اس کے جسم کی قیمت ادا کرنے کے لیے آمادہ ہو۔

اس منظر کی معنویت صرف اس انکشاف میں نہیں کہ دونوں بہن بھائی ہیں، بلکہ اس سوال میں ہے جو مصنف پورے معاشرے کے سامنے رکھتے ہیں۔ اگر ایک روحانی تربیت گاہ، جو اخلاق، تزکیۂ نفس اور انسان دوستی کی علامت سمجھی جاتی ہے، اپنی ہی بیٹیوں کو تحفظ، عزت اور انصاف فراہم نہ کر سکے تو اس کی روحانی بالادستی کس بنیاد پر قائم رہ سکتی ہے؟ ناول میں شہر بانو، کنیز اں اور جمال زادی تین مختلف نسلوں کی نمائندگی کرتی ہیں، لیکن تینوں کی تقدیر ایک ہی اقتدار کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس طرح مصنف یہ واضح کرتے ہیں کہ جب مذہبی اختیار احتساب سے آزاد ہو جائے، موروثی گدی خدمت کے بجائے اقتدار کی علامت بن جائے، اور عقیدت تنقیدی شعور کی جگہ لے لے تو دربار روحانی مرکز کے بجائے ایک ایسا ادارہ بن جاتا ہے جہاں طاقت اپنے ہر عمل کے لیے تقدس کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔

اس تناظر میں اصغر ندیم سید کا بیانیہ یونس جاوید کے "کنجری کا پل" اور طاہرہ اقبال کے "نیلی بار" سے ایک اہم ربط قائم کرتا ہے۔ "کنجری کا پل" میں بابا حضرت عطار اور "نیلی بار" میں پیر اسرار روحانی مقام کو عورت تک رسائی کا ذریعہ بناتے ہیں، جب کہ "ٹوٹی ہوئی طناب ادھر" اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اس پورے درباری ڈھانچے کی تاریخی اور اخلاقی شکست کو آشکار کرتا ہے۔ یہاں مسئلہ کسی ایک گدی نشین کے کردار کا نہیں بلکہ اس نظام کا ہے جو تقدیس کی آڑ میں طاقت، وراثت، جنس اور مفاد کو یکجا کر دیتا ہے۔ Pierre Bourdieu کے مطابق جب کسی ادارے کا علامتی سرمایہ (Symbolic Capital) اس کی حقیقی اخلاقی بنیادوں سے کٹ جائے تو اس کی ظاہری عظمت برقرار رہ سکتی ہے مگر داخلی جواز ختم ہو جاتا ہے۔ اصغر ندیم سید اسی داخلی انہدام کو جمال زادی اور موتی شاہ کے اس آخری آمنا سامنا میں مجسم کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ منظر صرف ایک ناول کا اختتام نہیں بلکہ اس پورے درباری نظام پر ایک گہرا ادبی، سماجی اور اخلاقی استغاثہ بن جاتا ہے، جہاں تقدیس کا نقاب اترتے ہی اقتدار کا اصل چہرہ سامنے آ جاتا ہے۔ ۱۴

اصغر ندیم سید ''ٹوٹی ہوئی طناب ادھر'' میں درباری نظام کو محض ایک مذہبی یا روحانی ادارے کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسے سماجی و ثقافتی ڈھانچے کے طور پر پیش کرتے ہیں جہاں تقدیس، اقتدار اور ذاتی مفادات باہم گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ جب سجادہ نشین اپنی روحانی حیثیت کو خدمتِ خلق کے بجائے شخصی مفادات، سیاسی اثر و رسوخ اور خاندانی اقتدار کے استحکام کے لیے استعمال کرتے ہیں تو دربار اپنی اخلاقی بنیادیں کھونے لگتا ہے۔ ایسے حالات میں عوام کا اعتماد مجروح ہوتا ہے، عقیدت اندھی اطاعت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور روحانی مراکز اصلاحِ باطن کے بجائے سماجی ناہمواریوں کے فروغ کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ناول میں بارہا یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ گدی نشین نہ صرف عوامی اور سیاسی معاملات میں اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں بلکہ عورت کو بھی اپنے اختیار کے دائرے کا حصہ سمجھتے ہیں، جس کے نتیجے میں مذہبی تقدیس اور ذاتی خواہشات کے درمیان حدِ فاصل بتدریج معدوم ہو جاتی ہے۔

اسی تناظر میں ناول کی ایک اہم فنی کامیابی یہ ہے کہ مصنف ملتان کی درگاہوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ چکلوں کی تاریخ کو بھی متوازی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ یہ تقابل اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان دو بظاہر متضاد دنیاؤں کے درمیان تعلق محض اتفاقی نہیں بلکہ ایک ہی سماجی ساخت کی پیداوار ہے۔ ناول کے متعدد کردار اس حقیقت

کی نمائندگی کرتے ہیں کہ چکلوں تک پہنچنے والی بہت سی عورتیں کسی نہ کسی مرحلے پر طاقت، دولت، جاگیرداری یا درباری نظام کی ناہمواریوں کا شکار بنتی ہیں۔اس طرح جسم فروشی کو محض انفرادی اخلاقی کمزوری کے بجائے ایک وسیع سماجی اور اقتداری بحران کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔

ناول کا اختتام اسی فکری مقدمے کو اپنے منطقی انجام تک پہنچاتا ہے۔جب جمال زادی کے سامنے اس کا اپنا سوتیلا بھائی مونی شاہ بطور خریدار آ کھڑا ہوتا ہے تو یہ منظر کسی ایک خاندان کے انتشار کی کہانی نہیں رہتا بلکہ پورے درباری نظام کی اخلاقی شکست کی علامت بن جاتا ہے۔یہی صورتِ حال یونس جاوید کے ناول ''کنجری کا پل'' میں بھی دکھائی دیتی ہے، جہاں خاندانی اور اخلاقی رشتے ہوس اور اقتدار کے سامنے اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔اصغر ندیم سید اس انجام کے ذریعے یہ واضح کرتے ہیں کہ جب روحانی مراکز اپنی اصل ذمہ داری سے انحراف کر کے اقتدار، نسب اور خواہشات کے مراکز بن جائیں تو اس کا سب سے المناک اثر انسانی رشتوں کے انہدام کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔یوں ''ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر'' درباری نظام، روحانی اختیار اور جنسی استحصال کے باہمی تعلق کو نہایت مؤثر انداز میں بے نقاب کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتا ہے کہ تقدس اسی وقت معتبر رہتا ہے جب اس کی بنیاد اخلاق، انصاف اور انسانی وقار پر استوار ہو، ورنہ وہ محض طاقت کے تحفظ کا ایک ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔اصغر ندیم سید،ٹوٹی ہوئی طناب ادھر،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۹ء،ص ۱۳۴

۲۔ Bourdieu, Pierre. Language and Symbolic Power. Edited by John B. Thompson, Translated by Gino Raymond and Matthew Adamson, Harvard University Press, 1991, pp. 163–170.

۳۔اصغر ندیم سید،ٹوٹی ہوئی طناب ادھر،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۹ء،ص ۱۲۷

۴۔ایضاً،ص ۱۲۸)

۵۔ایضاً،ص ۱۲۸)

۶۔اصغر ندیم سید،ٹوٹی ہوئی طناب ادھر،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۹ء،ص ۱۲۸

۷۔ایضاً،ص ۱۳۰

۸۔ایضاً،ص ۱۳۱

۹۔ایضاً،ص ۱۲۶

۱۰۔ایضاً،ص ۱۳۸

۱۱۔(اصغر ندیم سید،ٹوٹی ہوئی طناب ادھر،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۹ء،ص ۱۵۶)

۱۲۔ **Foucault, Michel.** The History of Sexuality. Volume 1: An Introduction. Translated by Robert Hurley, Vintage Books, 1990, pp. 92–102.

۱۳۔اصغر ندیم سید،ٹوٹی ہوئی طناب ادھر،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۹ء،ص ۱۵۷

۱۴۔ **Bourdieu, Pierre.** Masculine Domination. Translated by Richard Nice, Stanford University Press, 2001, pp. 34–45.